کلام امام حسین علیہ السلام

کی چند کرنیں

محسن غرویان

دار الثقلین

کلامِ امام حسین علیہ السلام

کی چند کرنیں

تالیف

محسن غرویان

ترجمہ

سید سعید حیدر زیدی

یکے از مطبوعاتِ

دار الثقلین

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳- کراچی ۷۴۶۰۰- پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دار الثقلین
DARUSSAQLAIN
P.O. Box No. 2133,
Karachi-74600 Pakistan

نام کتاب: کلامِ امام حسینؑ کی چند کرنیں

تالیف: حجت الاسلام محسن غرویان

ترجمہ: سید سعید حیدر زیدی

ناشر: دار الثقلین

طبع اول: محرم ۱۴۲۸ھ جنوری ۲۰۰۷ء

قیمت: ۲۵ روپے

العبد مجاور عباس اعوان یعسوبی

انتساب

آسمانِ ورسِ عمل کے مہ تمام،

عزتِ نوعِ انسان،

پروردگارِ آدمیت،

فاتحِ مرگ،

افتخارِ زندگی،

کشتگانِ عشق کے سردار

حسین ابن علی کے نام

فہرست

۱

قیام کا محرک

«انی لم اخرج اشراً وَلا بَطِراً وَلا مُفسِداً وَلا ظالماً وَانما خَرجتُ لِطَلَبِ الاِ صلاحِ فی اُمّةِ جَدّي (صلی الله علیه وآله وسلّم) اُریدُ اَنْ آمُرَ بِالْمَعْروفِ وانهیٰ عَنِ الْمُنکَرِ واَسیرُ بِسیرَةِ جَدّي وَاَبی علیٍّ بنِ ابیطالبِ فَمَنْ قَبِلَنی بِقَبُولِ الْحَقِ فَاللهُ اَولیٰ بِالْحَقِ وَمَنْ رَدَّ عَلَیَّ هذا اَصبِرُ حَتّي یَقضِیَ اللهُ بَینِي وَبَینَ القَومِ وهُوَ خَیرُالحاکمینَ»

«میں بڑا بننے، اکڑنے، عیش کوشی، فساد پھیلانے اور ظلم و ستم کے ارادے سے نہیں نکل رہا ہوں، بلکہ میں تو صرف اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لئے نکلا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ نیکیوں کی دعوت دوں اور برائیوں سے روکوں، اور اپنے نانا (حضرت محمد مصطفیٰؐ) اور اپنے پدر بزرگوار (علی مرتضیٰؑ) کی سیرت اور روش پر چلوں۔ جس نے میری باتیں قبول کیں، تو بے شک اس نے فرمانِ الٰہی کے

سامنے سرخم کیا ہے اور اگر کسی نے میری باتوں کو رد کیا تو میں صبر کروں گا۔ یہاں تک کہ خدا میرے اور اس گروہ کے درمیان فیصلہ کردے' اور خدا بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔))(۱)

تشریح و تفسیر

۱۔خروج کے معنی ہیں کسی مکان یا کسی جگہ وغیرہ سے باہر نکلنا۔اس مفہوم کے ساتھ ساتھ یہ لفظ حکومت کے خلاف مخالفانہ اقدام کے معنی بھی دیتا ہے۔اور اسی وجہ سے امام حسینؑ نے اپنے اس کلام میں اس لفظ سے استفادہ کیا ہے۔ حضرتؑ اس تعبیر کے ذریعے اس نکتے کا اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ کربلا کی سمت میرا سفر ایک معمول کا سفر نہیں' بلکہ اس سفر کا مقصد یزیدی حکومت کے خلاف ایک بنیادی انقلاب ایجاد کرنا ہے۔

۲۔ہر انقلاب اور اجتماعی عمل ایک نظریے پر مبنی اور ایک فکری نظام اور آئیڈیالوجی سے سرچشمہ لیتا ہے اور اسی بنا پر مختلف انقلابات اپنے اہداف ومقاصد' اسباب' آرزوؤں اور دوسری خصوصیات و امتیازات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علیحدہ پہچانے جاتے ہیں۔

ایک ایسا انقلاب جس کا سرچشمہ ایمان ہو' اور جو خداوند عالم پر اعتقاد کی بنیاد پر استوار ہو' وہ اپنی تمام باتوں میں ایک ایسے انقلاب سے مختلف ہوتا ہے جس کی بنیاد کسی شخص یا گروہ کے محدود ذاتی اہداف ومقاصد اور خواہشات ہوں۔ایک اسلامی اور الٰہی انقلاب وہ کہلاتا ہے جس میں اس انقلاب کے قائدین کی ذاتی خواہشات' تمنائیں اور احتیاجات کی تسکین ہدف (Goal) نہیں ہوتی' بلکہ اس کا مقصد الٰہی نظام کا قیام اور آسمانی احکام وفرامین کا اجرا ونفاذ ہوتا ہے۔

حضرت امام حسینؑ نے اپنے اس فرمان میں درحقیقت ایک غیر الٰہی انقلاب کی خصوصیات

۱۔بحار الانوار۔ج۱۰۔ص۱۷۵۔ مقتل خوارزمی۔ج۱۔ص۱۸۸۔ مقتل عوالم۔ص۵۴

کی جانب اشارہ کیا ہے۔ یعنی آپؑ یہ فرما کے کہ: میرا قیام تکبر، عیش کوشی، فساد اور ظلم و ستم کی غرض سے نہیں، یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ پست اور بے قیمت امور، صرف ایک غیر الٰہی انقلاب ہی میں ہدف و مقصد قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

پس تُعْرَفُ الْاَشْیاءُ بِاَضْدادِھا (اشیا کو ان کی ضد کے ذریعے پہچانا جاسکتا ہے) کے اصول کی روشنی میں پتا چلتا ہے کہ ان باطل محرکات اور مقاصد میں سے ہر ایک کی ضد ایک الٰہی اور آسمانی انقلاب کے اہداف و مقاصد میں شمار ہوگی، مثلاً:

خود خواہی کے برخلاف خدا خواہی۔

عیش کوشی کے برخلاف اپنی ذمے داری کی ادائیگی کے دوران مصائب و مشکلات پر صبر و تحمل۔

مفاسد اور خرابیوں کے برخلاف اصلاح اور برائیوں کی بیخ کنی۔

اور ظلم و ستم کے برخلاف عادلانہ الٰہی نظام کا قیام۔

لہٰذا اس کلام کی روشنی میں الٰہی انقلاب کو غیر الٰہی انقلاب سے جدا کر کے پہچاننے اور حقیقی انقلابیوں اور واقعی مصلحین اور جعلی انقلابیوں اور مصنوعی مصلحین کے درمیان تمیز قائم کرنے کے لئے ایک کسوٹی حاصل کی جاسکتی ہے۔

۳۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا شمار ان امور میں ہوتا ہے جنہیں اسلام نے واجب قرار دیا ہے اور ہر مسلمان پر فرض عائد ہوتا ہے کہ حتیٰ الامکان نیک اور پسندیدہ امور کی ترویج کے لئے جدو جہد کرے، اور اسکے برخلاف جب کسی ناپسندیدہ چیز کو دیکھے تو اسکے خاتمے کی کوشش کرے۔ اور اگر خطرہ یہاں تک جا پہنچے کہ دین کی بنیاد ہی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، یا اسلامی نظام کی بقا خطرے میں پڑتی دکھائی دے، تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اور سنگین ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بقائے دین اور نظامِ اسلامی کی حفاظت کے لئے جان نثاری اور فداکاری ضروری ہو جاتی ہے اور مدافعانہ (Defensive) یا حملہ ورآنہ (Offensive) جہاد واجب ہو جاتا ہے۔

امام حسینؑ بھی یزیدی نظام کے خلاف اپنے قیام کا تعارف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ایک زندہ مثال کی حیثیت سے کراتے ہیں اور اسے ایک دینی فریضہ قرار دیتے ہیں۔ دینی واجبات پر عمل صرف ایک یا چند افراد کی ذمے داری نہیں' بلکہ تمام انبیا' ائمہ اور دوسرے افراد معاشرہ پر احکام و فرامینِ الٰہی عائد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امامؑ اپنے اس کلام میں اس مفہوم کی جانب اشارہ فرماتے ہیں کہ جس چیز پر میں عمل پیرا ہوں اور جن اہداف و مقاصد کے حصول کی کوششوں میں' میں مصروف ہوں' وہ ہرگز نئی چیزیں اور بدعتیں نہیں ہیں بلکہ درحقیقت وہی اہداف و مقاصد ہیں جن کے لئے میرے جد رسولِ خداؐ اور میرے والد امیر المومنین علی مرتضیٰؑ سرگرداں تھے۔

یہاں ہم یہ نکتہ حاصل کرتے ہیں کہ تمام انبیائے الٰہی' ائمہٴ اطہارؑ اور دینی رہنماؤں کے اہداف و مقاصد یکساں ہیں۔ اور سب الٰہی مقاصد کو جامہٴ عمل پہنانے کے لئے کوشاں ہیں۔ البتہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے زمانے کے تقاضوں اور اپنے معاشرے کے احوال و کوائف کے مطابق اپنی الٰہی ذمے داری کی ادائیگی اور اپنے فریضے کی بجا آوری کے لئے ایک خاص طریقہٴ کار بنایا ہے اور اس سلسلے میں بعض کم اور بعض زیادہ اپنے اہداف و مقاصد کے حصول میں کامیاب رہے ہیں۔

کسی طرزِ فکر یا دین کی حقانیت یا عدمِ حقانیت کا پیمانہ اسکے پیروکاروں کی کثرت یا قلت نہیں۔ کبھی بھی کسی فکر کے ماننے والے افراد کی کمی یا زیادتی کو اسکے حق یا باطل ہونے کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا کسی فکر اور عقیدے کی جانب ہمارا جھکاؤ کبھی بھی اس عقیدے کے پیروکاروں کی کثرت کی بنیاد پر نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی کسی فکر اور عقیدے کے ماننے والوں کی قلت دیکھ کر ہمیں اس سے دور ہونا چاہئے۔ لہٰذا ایک ایسا عقیدہ جس کی بنیاد عقل اور وحی پر کھڑی ہوئی ہو اور جس کی حقانیت بخوبی واضح ہو' اگر اس کا کوئی ایک بھی ماننے والا نہ ہو' تب بھی وہ عقیدہ اپنی حقانیت سے محروم نہیں ہوتا۔ اگر ہم کسی آسمانی کتب اور دینِ الٰہی کی حقانیت پر عقیدہ رکھتے ہیں' تو ہمیں کسی بھی

صورت میں اس کے ماننے والے افراد کی کمی اور اسکے پیرکاروں کی قلت سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔اس سلسلے میں امیرالمومنینؑ کا یہ کلام کس قدر خوبصورت ہے کہ: لا تستوحشوا فی طریق الحق لقلۃ اھلہ (راہ ہدیت پر افراد کی قلت سے خوف وہراس میں مبتلا نہ ہونا۔نہج البلاغہ۔خطبہ۱۹۹)

یہ اہم نکتہ ابی عبداللہ الحسینؑ کے اس کلام سے بخوبی آشکارا ہے' آپؑ دوٹوک الفاظ میں فرماتے ہیں کہ جو کوئی ہمارے کلام کو اور ہمارے دعوے کی حقانیت کو قبول کرتا ہے' ہمیں اس سے غرض نہیں' در حقیقت اس نے کلام الٰہی کو قبول کیا ہے' لیکن جو کوئی ہماری دعوت میں رکاوٹ ڈالے گا اور اسکے خلاف جنگ کا پرچم بلند کرے گا' تو ہم بھی اسکے خلاف ثابت قدمی کے ساتھ ڈٹ جائیں گے' یہاں تک کہ حق باطل پر چھا جائے اور خدا کا فرمان زمین پر جاری ہو جائے۔ اصبر حتی یقضی اللہ بینی و بین القوم و ھو خیر الحاکمین۔

۲

حق و باطل کی ازلی جنگ

«لَو لَم یَکُنْ فی الدُّنیا مَلْجَأً ولا مَأوىً لَما بایَعتُ یَزیدَ بنَ مُعاوِیَة»

«اگر اس وسیع وعریض دنیا میں میرے لئے کوئی بھی پناہ گاہ نہ رہے تب بھی میں یزید ابن معاویہ کی بیعت نہیں کروں گا۔» (۱)

تشریح و تفسیر

۱۔ بے شک انقلابی اور مکتبی رہنماؤں کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ان کا صاف گو اور بے باک ہونا بھی ہے۔ ان کی یہ صفت نہ صرف دشمن کے حوصلوں کو پست کرنے میں انتہائی موثر ہوتی ہے بلکہ ان کے اپنے طرفداروں اور پیروکاروں کے عقیدے کی مضبوطی اور استواری کا سبب بھی بنتی ہے اور انہیں بلند حوصلہ اور عزمِ صمیم عطا کرتی ہے۔

۱۔ مقتل خوارزمی۔ ج ۱۔ ص ۱۸۸۔ مقتل عوالم۔ ص ۵۴

امام حسینؑ کے مذکورہ بالا کلام میں سب سے پہلی قابلِ توجہ بات اس کلام کا واضح ہونا اور اس کا لب ولہجہ ہے' جو اپنے مکتب اور عقیدے کی حقانیت پر عزمِ راسخ اور پختہ ایمان کا عکاس ہے اور خود یہ چیز تمام انقلابی رہنماؤں کے لئے نمونۂ عمل ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط ارادوں کے حامل رہنماؤں اور ڈھل مل یقین اور کمزور ارادے کے حامل لیڈروں کی پہچان کا ایک معیار ہے۔(۱)

۲۔ حاکمیتِ الٰہی کے لئے مصروفِ کار ایک اجتماعی تحریک اور انقلابی جنبش کو صرف اور صرف خدا کی قدرت پر بھروسہ کرنا چاہئے اور اسکے سوا کسی جائے پناہ پر نظر نہیں رکھنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر تمام شیطانی قوتیں اس تحریک کے خلاف جنگ کا پرچم بلند کر دیں' تب بھی اسے خوف وہراس میں مبتلا نہیں کر سکیں گی۔

امامؑ اپنے اس کلام میں انتہائی واضح انداز میں اعلان فرما رہے ہیں کہ میں نے خدا کے سوا کسی شخص یا کسی طاقت پر بھروسہ نہیں کیا ہے اور جہاں کہیں بھی ہوں اپنی صدائے مظلومیت اور اسلام کی حقانیت کی آواز عالمِ بشریت کے کانوں تک پہنچاتا رہوں گا اور کائنات کے ہر ہر ذرّے کو آزادی اور حریت کی دعوت دوں گا۔

۳۔ جس طرح دن کی روشنی اور رات کی تاریکی کا ملاپ نہیں ہو سکتا' اسی طرح حق اور باطل کے درمیان بھی آپس میں نباہ ممکن نہیں۔ کیونکہ نور اور ظلمت' سفیدی اور سیاہی ایک دوسرے سے ایسے متضاد امور ہیں جن کا ایک جگہ جمع اور متحد ہونا کسی صورت ممکن نہیں۔ لہٰذا تاریخِ بشریت کے اوراق ہمیشہ ان دو گروہوں کے باہمی تصادم کے گواہ ہیں۔

تاریخ کے کسی دور میں حق اور باطل کے پیروکار' آپس میں صلح ومسالمت کے ساتھ نہیں رہ

---

۱ جب ایران کے اسلامی انقلاب کے قائد امام خمینیؒ کو جبراً عراق چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تو آپ نے فرمایا تھا کہ: اگر کسی حکومت نے مجھے اپنے ملک میں اقامت کی اجازت نہ دی' تو میں کشتی میں سوار ہو کر سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کے درمیان اپنی صدا کو جو دراصل مظلوم مسلمانوں کی صدا ہے' اہلِ دنیا کے کانوں تک پہنچاؤں گا۔

سکے اور نہ رہ سکتے ہیں۔

امام حسینؑ اپنے کلام میں دنیا بھر کے حریت پسندوں کے قائد کی حیثیت سے یزید کا برائی، بدکرداری اور ظلم و ستم کی علامت کے طور پر تعارف کراتے ہوئے انتہائی واضح الفاظ میں یہ اعلان فرماتے ہیں کہ تاریخ کے تمام حسین اور حسینی، یزید ابن معاویہ جیسے ظالموں اور تاریخ کے دوسرے یزیدیوں کے ہاتھ پر نہ تو کبھی بیعت کریں گے اور نہ ہی ان سے مصالحت اور ساز باز کریں گے۔

❁❁❁

۳

امام اور امامت

«فَلَعَمْرِي مَا الإِمَامُ اِلاَّ العَامِلُ بِالکِتَابِ وَالآخِذُ بِالقِسْطِ وَالدَّائِنُ بِالْحَقِّ وَالحَابِسُ نَفْسَهُ عَلیٰ ذَاتِ اللّٰہِ۔»

«میری جان کی قسم، سچا پیشوا اور امام برحق وہی ہے جو کتاب خدا پر عمل کرتا ہو، جو عدل و انصاف پر کاربند ہو، جو حق کا پیروکار ہو، جس نے اپنا پورا وجود راہ خدا میں وقف کر دیا ہو اور صرف اسی کا فرمانبردار ہو۔» (۱)

تشریح و تفسیر

۱۔ اس کلام میں امام حسینؑ کا امام اور امامت کے لئے شرائط بیان کرتے ہوئے قسمیہ الفاظ سے کام لینا نیز «الا» کا کلمہ استعمال کرنا، آپؑ کی نظر میں ان شرائط و صفات کی اہمیت اور ان پر تاکید کا عکاس ہے۔ یہاں تک کہ کسی بھی صورت مناسب نہیں کہ انسان ان صفات کو کم اہمیت سمجھے اور ان

۱۔ کتاب الارشاد، ص ۲۰۴؛ مقتل خوارزمی، ج۱، ص ۱۹۶،۱۹۵۔

سے غفلت اور لاپرواہی برتے۔

۲۔ امتِ اسلامی کی امامت و رہبری، کوئی سادہ اور آسان کام نہیں۔ اور ہر کوئی آسانی کے ساتھ اس مقام کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ امامت آسمانی احکام کی انجام دہی کی ذمے داری، اور کارِ رسالت کا تسلسل ہے، اور یہ خود ایک ایسا بارِ گراں ہے جسے اٹھانے کے لیے پیغمبر جیسی شخصیت کا ہونا ضروری ہے جو اس راہ پر قدم رکھے اور اس سنگین ذمے داری کو قبول کرے۔ لہٰذا امامؑ میں سخت اور کڑی صفات کا پایا جانا ضروری ہے۔ تاکہ ہر کوئی امامت اور رہبری کا جھوٹا دعویٰ نہ کرے۔ اور لوگوں کے پاس بھی امامت کے حقیقی دعویداروں اور جھوٹے مدعیوں کی پہچان کا ایک پیمانہ موجود ہو۔

مذکورہ بالا کلام اور اسکی جملہ بندی پر غور اور گہرائی کے ساتھ اسکے جائزے کے ذریعے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام میں یہ تمام شرائط موجود ہونا چاہئیں۔ اور کسی فرد میں ان میں سے ایک یا چند شرائط کی کمی اسکے ادعائے امامت کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہوگی۔

۳۔ امام کا یہ کلام ایک طرف تو امامِ حق کی خصوصیات بیان کر رہا ہے اور دوسری طرف اسلامی تعلیمات میں امامت کے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ کتابِ خدا پر عمل، عدل و انصاف کا لحاظ رکھنا، حق و حقیقت کا اجرا اور صرف خدا کے سامنے تسلیم ہونا، وہ خصوصیات ہیں جن کے ذریعے امام اور حقیقی پیشوا کو پہچانا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف امامت کا مفہوم اسکے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں کہ امامت یعنی کتابِ آسمانی کے احکام کے اجرا اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں میں عدل و انصاف کے قیام کے لیے کارِ رسالت کو مسلسل جاری رکھنا۔

۴

دنیا، امامؑ کی نگاہ میں

فَاِنْ تَكُنِ الدُّنيا تُعَدُّ نَفِيسَةً — فَدَارُ ثَوابِ الاَعمالِ اَعْلا وَاَنْبَلُ
وَاِنْ تَكُنِ الاَموالُ لِلتَّرْكِ جَمْعُها — فَما بالُ مَتْرُوكٍ بِهِ المَرْءُ يَبْخَلُ
وَاِنْ يَكُنِ الاَبْدانُ لِلْمَوْتِ اَنْشِئَتْ — فَقَتْلُ امْرَاءٍ بِالسَّيْفِ فِى اللّٰهِ اَفْضَلُ

«سمجھ رکھو کہ یہ فانی دنیا' جتنی بھی قیمتی ہو' (اس دوسرے جہاں کے بالمقابل پست اور بے قیمت ہے) اور جہانِ آخرت بلند مرتبہ اور بیش قیمت ہے۔»

«اگر حقیقتاً ایسا ہی ہے کہ مال و دولت جمع کرنے کے بعد بالآخر اسے یہیں چھوڑ جانا ہوتا ہے' تو پھر انسان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ' دنیوی مال و دولت کے بارے میں اس قدر بخل سے کام لیتا ہے۔»

«اور اگر دنیا میں ہمارا یقینی انجام موت ہے اور لازماً ان جسموں کو نابود ہو جانا ہے' تو پھر کیا ایمان اور عقیدے کی راہ میں جان دے دینا' ہر قسم کی دوسری موت سے زیادہ گراں قدر اور بلند تر نہیں ہے؟!»(۱)

۱۔ مقتلِ خوارزمی ۔ ج۱ ۔ ص ۲۲۳' مناقب ۔ ج۳ ۔ ص ۹۵۔

تشریح و تفسیر

اسا چھی اور قیمتی چیزوں کی پہچان کا ایک ذریعہ ان کا بری اور بے قیمت چیزوں کے ساتھ موازنہ اور تقابل ہے۔ ہمیں بینائی کی قدر و قیمت اس وقت بہتر طور پر معلوم ہوتی ہے جب ہمارے سامنے کوئی نابینا آ جاتا ہے۔ جب کسی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں تو صحت و سلامتی کی قدر پتا چلتی ہے' اسی طرح امن و عافیت کی قیمت اس وقت واضح ہوتی ہے جب مصیبت اور بے امنی کا مزہ چکھتے ہیں۔

اگر ہم اس مادّی دنیا اور اس دنیا کے مظاہر کی اہمیت کو صحیح طرح سمجھنا چاہتے ہیں' تو ہمیں چاہئے کہ اس کا دوسری دنیا (آخرت) کے ساتھ موازنہ کریں' تب ہی ہم پر اس کی اہمیت یا بے وقعتی واضح اور نمایاں ہوگی۔

قرآنِ کریم بھی مختلف مواقع پر دنیا اور آخرت کا باہمی تقابل کرتا ہے اور فرماتا ہے:

والآخرۃ خیرٌ وابقی (آخرت اور جو کچھ اس میں بہتر اور باقی رہنے والا ہے)

یہ آیت اچھے انداز سے اس دنیا پر آخرت کی برتری کا سبب آشکار کرتی ہے کیونکہ:

اولاً: عالمِ آخرت کی نعمتوں کو کیفیت کے لحاظ سے بہتر بتاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جہانِ آخرت در حقیقت عالمِ معنا اور جہانِ مادّی عالمِ صورت ہے۔ بالفاظ دیگر یہ مادّی دنیا وہ ظاہر ہے' جس کا باطن آخرت تشکیل دیتی ہے اور یقینی طور پر صورت کے مقابل عالمِ معنا اور ظاہر کے مقابل باطن کا رتبہ اور اعتبار کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے۔

ثانیاً: آخرت کی نعمتیں ہمیشہ رہنے والی اور پائیدار ہیں۔ لہٰذا اصولاً اس مادّی دنیا اور اس کے محدود مظاہر کا آخرت کی لامحدود دنیا سے موازنہ کیا ہی نہیں جاسکتا اور عقل بھی کہتی ہے کہ محدود اور لامحدود کے مابین کوئی نسبت نہیں۔

تاہم قرآنِ کریم نے مفہوم کو زیادہ سے زیادہ محسوس تر صورت میں بیان کرنے اور ہمارے لئے قابلِ فہم بنانے کی خاطر موازنے اور تقابل کا راستہ اختیار کیا ہے اور دنیاوی نعمتوں کے مقابل

اُخروی نعمتوں کو دائمی' پائیدار اور بہتر اور عالی تر کیفیت کا حامل قرار دیا ہے۔

امام حسینؑ کے اشعار کے پہلے بیت میں دنیا اور اس کے مظاہر کی بے وقعتی اور بے اعتباری ثابت کرنے کے لئے دنیا اور آخرت کے موازنے کی اسی قرآنی روش سے استفادہ کیا گیا ہے۔ دوسری طرف پہلے مصرع میں شرطیہ جملے کی صورت میں یہ فرما کر کہ ''اگر ایسا ہے کہ دنیا واقعاً نفیس اور بااہمیت ہے'' اس مفہوم کو واضح کیا گیا ہے کہ امامؑ کی نظر میں یہ اہمیت صرف فرضی اور تصوراتی ہے ورنہ واضح ہے کہ در حقیقت دنیا ناپائیدار اور بے اہمیت ہے۔

۲۔ بے شک اگر انسان مستقبل اور معاملات کے انجام سے آگاہ ہو تو اس کے فیصلے اور اقدامات کی کیفیت دوسری ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ بہت سے ایسے کام انجام نہیں دیتا جو بظاہر اچھے نظر آتے ہیں اور اس کے برخلاف بعض اوقات ایسے کام انجام دیتا ہے جو غیر مفید اور بے نتیجہ شمار کئے جاتے ہیں۔

علم و آگہی' عمل کا مقدمہ ہے۔ اگر ایک طالب علم کو اس بات کا یقین ہو کہ اسے سالانہ امتحان میں فیل کر دیا جائے گا' تو اس کا دل پڑھائی کی جانب سے اُچاٹ ہو جائے گا۔ لیکن اس کے برخلاف اچھے مستقبل کی امید انسان کو ایک اور ہی طرح کا شوق و اشتیاق اور جوش و خروش بخشتی ہے اور اسے عمل اور جدوجہد پر ابھارتی ہے۔

اگر انسان حیات اور کائنات کے اختتام اور انجام کے بارے میں تھوڑا سا بھی غور و فکر کرے' اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے جدائی کے لمحے کو ذہن میں لائے' اپنے گھر' اپنے باغ' اپنی زمین' اپنی گاڑی وغیرہ سے وداع کے وقت کا تصور کرے' تو یقیناً اس کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو گی۔ ان امور سے اس کے انس' الفت اور شدید محبت کا رشتہ کمزور ہو جائے گا۔ اسی بنا پر ائمۂ دین کی احادیث میں آیا ہے کہ: کَفٰی بِالْمَوتِ وَاعِظاً۔

ایک متوازن مزاج اور نصیحت قبول کرنے والے انسان کے لئے وعظ و نصیحت اور کردار سازی کے لئے موت کی یاد ہی کافی ہے۔

اصولاً اگر انسان موت کے وقت کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھے اور دنیاوی زندگی کا انجام اس کے پیش نظر رہے' تو اس کا شعور اس بات کی گواہی دے گا کہ دنیاوی اشیا پر اس کی مالکیت صرف ایک مصنوعی' مجازی اور عارضی مالکیت ہے اور بالآخر وہ بھی اس دنیا کے نظام کے تحت موت کے عفریت کے ہاتھوں ختم ہو جائے گا۔

دولت جمع کرنا ہرگز اسکی مالکیت کا سبب نہیں ہوتا۔ البتہ ممکن ہے ایک طرح کا تعلق' اضافہ اور اعتباری نسبت وجود میں لے آئے۔ لیکن بہر حال انسان کے لئے حقیقی مالکیت وجود میں نہیں آتی۔ کیونکہ بالآخر یہ ملکیت خود بخود مالک سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس اہم نکتے کو امام حسینؑ نے ان اشعار کے دوسرے بیت میں بخوبی واضح کیا ہے۔ سچ! اگر انسان دنیاوی مال و دولت کی ناپائیداری اور حقارت کو جان لے' تو کسی صورت اس کا اسیر نہ ہو' اس سے دل نہ لگائے اور کسی بھی صورت میں حرص وآز' حسد اور بخل جیسی مذموم صفات میں گرفتار نہ ہو۔

۳۔ شہادت کے مسئلے کے جائزے اور اسکی تحلیل کے نتیجے میں ممکن ہے اس کے دو مختلف رُخ سامنے آئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس مسئلے کا دو مختلف انداز سے سامنا کر سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اس کا سامنا جذبات واحساسات کے ساتھ کریں اور دوسرا یہ کہ اسے عقلی انداز سے دیکھیں۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ ممکن ہے جب ہم کسی واقعے کا سامنا احساسات وجذبات سے مغلوب ہو کر کر رہے ہوں تو یہ ایک خاص قسم کے ردِعمل کا تقاضا کرے' جبکہ اگر ہم اسی واقعے کا سامنا اور اس کا تجزیہ عقلی انداز سے کریں' تو وہ اس سے مختلف ردِعمل کا تقاضا کرے۔

آپ سرِ راہ ایک بچے کو دیکھتے ہیں' جسے ایک عمر رسیدہ شخص پیٹ رہا ہے۔ آپ بے اختیار اس بچے کی حمایت میں آگے بڑھتے ہیں اور اس مارنے والے شخص کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ اور اس پہلے مرحلے میں اس پٹنے والے بچے کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔

جو چیز آپ کے اس ردِعمل اور اس بچے سے ہمدردی کا باعث ہوئی ہے' وہ یہ ہے کہ آپ نے صرف آنکھوں سے اس حادثے کا مشاہدہ کیا ہے اور جذبات واحساسات کے ذریعے اس

مسئلے کا جائزہ لیا ہے۔ اس موقع پر کسی قسم کا منطقی تجزیہ و تحلیل آپ نے نہیں کیا۔

اب اس ابتدائی ردعمل کے بعد آپ جستجو کرتے ہیں کہ آخر ماجرا کیا ہے' وہ شخص اس بچے کو کیوں مار پیٹ رہا تھا۔ پتا چلتا ہے کہ اس بچے نے بے وجہ اس راہ گیر شخص کو ایک پتھر دے مارا تھا اور اس سے بدزبانی بھی کی تھی اور بغیر کسی وجہ کے اسے گالیاں دے رہا تھا اور یہی بدتمیزی اسکی پٹائی کی وجہ تھی۔

اب آپ عقلی تجزیے اور منطقی فیصلے کی بنیاد پر اس راہ گیر شخص کو حق بجانب قرار دیتے ہیں اور آپ بھی بچے کو ڈانتے ہیں اور ممکن ہے آپ بھی اسے دو ہاتھ رکھ دیں۔

یہ متضاد فیصلے اور ان کے نتیجے میں دو مختلف قسم کے ردعمل اس معاملے کو دو مختلف انداز سے دیکھنے کی وجہ سے ہیں۔ مسئلے کو جذبات و احساسات سے مغلوب ہو کر دیکھنے کا تقاضا یہ تھا کہ آپ راہ گیر شخص کو قصوروار ٹھہراتے اور بچے کو حق بجانب اور مظلوم سمجھتے۔ اور اس کے برعکس مسئلے کا عقلی اور منطقی تجزیہ و تحلیل راہ گیر شخص کو حق بجانب اور بچے کو سرزنش اور پٹائی کا مستحق قرار دیتا ہے۔ اور واضح ہے کہ مسئلے کا سامنا کرنے کے ان دو انداز میں سے عقلی انداز قابلِ قدر اور حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔

اگر ہم شہادت کو جذبات و احساسات کی نگاہ سے دیکھیں اور اسے سطحی اور سرسری انداز سے لیں تو اس کی ایک خاص شکل سامنے آئے گی۔ کیونکہ اس طرزِ فکر کی صورت میں شہادت جان کے زیاں' بربادی' نابودی اور آخرکار خود اختیاری موت کے سوا کچھ اور نہیں دکھائی دے گی اور اس اندازِ فکر کا تقاضا یہ ہوگا کہ شہادت پر انتہائی افسوس' غم واندوہ اور بے صبری کا مظاہرہ کیا جائے۔ اس نکتۂ نظر کے ساتھ شہادت نہ صرف یہ کہ کسی تقدس کی حامل نہیں بلکہ کراہت و قباحت بھی رکھتی ہے۔ کیونکہ بظاہر یہ ایک قسم کی خودکشی معلوم دے گی۔ شہادت میں موت انسان کی طرف نہیں آتی ہے' بلکہ اس کے برعکس انسان موت کے استقبال کو بڑھتا ہے اور موت کا انتخاب کرتا ہے۔ جذبات و احساسات سے مغلوب ہو کر اور صرف ظواہر کو دیکھ کر اس طرح موت کا استقبال ایک

طرح کا جنون سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر شہادت کے مسئلے کا عقلی تجزیہ و تحلیل کریں تو ہم ایک مختلف نتیجے تک پہنچیں گے۔

بے شک تمام انسانوں کو لازماً موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور کوئی اس سے راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتا۔ ہم سے پہلے آنے والے گزر چکے ہیں، اس وقت ان میں سے کوئی ہمارے درمیان موجود نہیں۔ دوسری طرف موت کے مختلف اسباب و اقسام ہیں، جیسے حادثاتی موت، (روحانی یا جسمانی) امراض کے نتیجے میں موت، پانی میں ڈوب کے مرجانا، خودکشی کر لینا، پہاڑ یا بلندی سے گر کر مرجانا وغیرہ وغیرہ۔ اسی کے ساتھ ساتھ موت کی ایک خاص قسم بھی پائی جاتی ہے جسے انسان خود اپنی آزادی اور اختیار کے ساتھ منتخب کرتا ہے، یہ عقیدے، آزادی اور انسانیت کی راہ میں اختیاری اور انتخابی موت ہے۔ بالفاظ دیگر یہ معبودِ حقیقی اور خالقِ کائنات کی راہ میں موت قبول کرتا ہے۔

منصف مزاج اور اہلِ معرفت افراد موت کی مختلف اقسام میں سے کونسی موت کا انتخاب کریں گے؟ انسان کے ضمیر اور عقلِ سلیم کی نظر میں کونسی موت افضل ہے؟ پہلی قسم کا مرنا یا عقیدے اور دین کی راہ میں شہادت کی موت کو گلے لگانا؟

اگر ہم تمام مذکورہ مقدمات سے قطع نظر کر کے ایک منطقی قیاس تشکیل دیں، تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب موت لامحالہ ہم سب کے تعاقب میں ہے اور ہمارا مرنا قطعی اور حتمی ہے تو مسلّمہ طور پر شہادت، موت کی مقدس ترین اور قیمتی ترین قسم ہے۔

اس تجزیے و تحلیل کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شہادت ایسی موت نہیں جس کا سامنا کرتے ہوئے انسان ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرے، دکھ اور افسوس محسوس کرے، اسے اپنی جان کا تلف اور برباد ہونا خیال کرے۔

البتہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں انسان کے پاس ادراک کی دو قوتیں ہیں، ایک عقل اور دوسری احساس۔ لہٰذا وہ لازماً ادراک کی ان دو قوتوں کے تقاضوں کے مطابق شہادت پر ایک خاص ردِعمل کا اظہار کرتا ہے۔ اسے صرف جذبات و احساسات کی نگاہ سے دیکھنے کا تقاضا رونا، گڑگڑانا

اضطراب و ناگواری کا اظہار اور اس سے فرار ہے۔ اس مقام پر عقل جذبات و احساسات کی مدد کو بڑھ کر اسے کنٹرول کرتی ہے اور شہادت کے بارے میں اپنی منطقی اور حقیقت پسندانہ تحلیل کے ذریعے انسان کو اطمینان اور آسودگی دے کر اس کے دل کو تسلی دیتی ہے اور وہ بخوشی اس کے استقبال کو بڑھتا ہے۔

اس تفصیلی گفتگو کے بعد اب وہ مناسب وقت آ پہنچا ہے جب ہم امام حسینؑ کے ان اشعار کے تیسرے بیت پر غور کریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے کہا وہ اس بیت میں خلاصے کے طور پر اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں:

«بے شک اگر یہ بدن آخر کار فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے، اور یہ اگر موت کا عفریت آخر کار ہمیں اپنے جبڑوں میں جکڑ لے گا۔ اگر طے ہے کہ بالآخر موت ہمیں چھین لے گی، تو پس کیا اچھا ہے کہ ہم خود ایک شریفانہ اور خدا کی راہ میں موت کا انتخاب کریں۔»

۵

حاکم اور حکومت کی اہمیت

«وَعلی الاِسلامِ السَّلامُ اِذْ قد بُلیتِ الاُمّۃُ بِراعٍ مثلِ یَزید»

«جب امت یزید جیسے حکمراں کی مصیبت میں مبتلا ہو جائے' تو اسلام کا خدا ہی حافظ ہے۔»(۱)

تشریح و تفسیر

۱۔ شاید معاشرے اور اس کے مختلف شعبوں کو انسانی بدن کے نظام سے تشبیہ دی جا سکے۔ معاشرے کے اقتصادی' سیاسی' اخلاقی اور عسکری شعبے انسانی بدن کے اعصابی نظام' نظامِ ہضم اور نظامِ تنفس کی مانند ہیں۔

انسانی بدن کے مختلف نظاموں کے طرز کار اور میکنزم کے مطالعے کے ذریعے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس میں «دماغ» کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کا کام بدن کے دوسرے نظاموں کو کنٹرول کرنا اور انہیں ہدایات جاری کرنا ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر دماغ کے کام میں معمولی سا بھی

۱۔ مقتل عوالم۔ ص ۵۳؛ مقتل خوارزمی۔ ج ۱۔ ص ۱۸۵

خلل واقع ہو جائے تو دیگر اعضائے بدن بھی توازن اور کنٹرول سے محروم ہو کر بخوبی کام کرنا چھوڑ دیں گے۔

معاشرہ جس کے تمام اعضا ایک جسم کے نظام واعضا کی مانند سمجھے جاتے ہیں اس میں بھی حکومت اور ریاست کا ادارہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے اور ایک خاص کردار رکھتا ہے۔

حکومت انسانی بدن میں موجود دماغ کی مانند معاشرے کے مختلف نظامات اور شعبوں کے کنٹرول اور ان کی ہدایت کی ذمے دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کے نظام میں معمولی سا نقص اور ضعف معاشرے کے تمام دوسرے شعبوں پر اثر انداز ہو کر ان میں بھی خلل اور کمزوری پیدا کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر اسلامی تعلیمات میں حکومت اور قیادت کا مسئلہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں تک کہ ولایت وحکومت کو دین کا رکن اور اساس قرار دیا گیا ہے کہ جس پر دوسرے دینی نظامات کی بنیاد قائم ہے اور اسکے بغیر اسلام کے کسی بھی اجتماعی حکم وفرمان کا اجرا ونفاذ ممکن نہیں ہوگا۔(۱)

اس گفتگو کی روشنی میں امام حسینؑ کے مذکورہ بالا کلام کے معنی ومفہوم واضح ہو جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ درحقیقت اگر حکومتِ اسلامی اور امت کے نظامِ رہبری میں خلل واقع ہو جائے وہ ضعف وانحراف کا شکار ہو جائے تو پھر کوئی بھی آسمانی حکم اور تعلیم اسلامی معاشرے میں درست طور پر جامۂ عمل نہیں پہن سکے گی۔ پس یزید کی مانند طاغوتی حکومتوں کی موجودگی میں اسلام پر فاتحہ پڑھ لینی چاہئے اور اس سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔

۲۔ کسی معاشرے پر حکومت اور قدرت کا حصول دو طریقوں سے ممکن ہے:

الف: جبری تسلط کے ذریعے۔

۱۔ لو لم يجعل لهم اماما قيما حافظا مستودعا لدرست الملة اگر کسی اسلامی معاشرے میں اسلامی احکام کے اجرا کا حافظ ونگہبان کوئی زعیم اور قائد نہ ہو تو ایسی قوم بکھر کے رہ جائے گی۔ الامام نظام دين۔ (حاکم اور امام امت اسلامی کا نظام اور قوام دین ہے۔) ملاحظہ فرمایئے ولایت فقیہ از امام خمینیؒ۔

ب: لوگوں کی رضامندی سے۔

پہلی صورت میں ایک چھوٹا لیکن طاقت ور گروہ' جس کے افکار و رجحانات ممکن ہے معاشرے کی اکثریت کی خواہشات و میلانات کے برخلاف ہوں' زور وزبردستی' طاقت و اسلحہ کے زور پر معاشرے پر حاکم حکومت کو گرا کر حکومت و اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اس طریقے سے حکومت کے حصول کو ایک کمتبی اور اجتماعی انقلاب کی بجائے درحقیقت بالجبر اقتدار پر قبضے (Cope) کا نام دیا جانا چاہئے۔

اس کے برعکس کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاشرے میں ایک انقلاب اور جنبش پیدا ہوتی ہے اور افراد معاشرہ ظالم حکمرانوں سے سخت مقابلے اور طویل جدوجہد کے بعد اپنی رضا اور اختیار سے ایک گروہ کو معاشرے کے معاملات چلانے اور اسکے نظم ونسق کے لئے چنتے ہیں۔ یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک اجتماعی تحریک اور انقلاب کے نتیجے میں ایک حقیقی اور عوامی حکومت برسرِکار آئی ہے اور اس نے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لیا ہے۔

اسلامی تاریخ میں اکثر ظالم حکمراں لوگوں کی خواہشات اور ارادوں پر توجہ کئے بغیر اقتدار پر قابض ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لئے ایک وسیلے کے طور پر منصب اقتدار سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان سیاہ تاریخی ادوار میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ حکومت و ریاست کے تعین کے سلسلے میں واقعاً لوگوں کے ارادے اور انتخاب کا کوئی کردار رہا ہے۔

تاریخ اسلام کے ایسے ہی غاصب اور ظالم حکمرانوں کی نمایاں مثالوں میں سے ایک مثال یزید ابن معاویہ ہے' جو ظلم وستم' عیش وعشرت اور عیاشی سے دلدادگی کی علامت ہے۔

امام حسینؑ نے اپنے اس کلام میں «بُلِیَتْ» کے لفظ کے ذریعے دو لطیف نکات کی جانب اشارہ فرمایا ہے:

☆ ایک تو یہ کہ اس لفظ کے معنی مصیبت اور بلا میں مبتلا ہونے کے ہیں۔ لہٰذا یہ اس بات کا

عکاس ہے کہ امام حسینؑ کی نظر میں یزید جیسے شخص کی حکومت ایک بلا اور مصیبت ہے۔

☆ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہاں حضرت فعل مجہول بُلِیَتْ استعمال کر کے درحقیقت اس مفہوم کا اعلان و اظہار فرما رہے ہیں کہ ایسی حکومتیں کبھی عوام کی پسند اور حمایت سے برسر اقتدار نہیں آتیں بلکہ امت اور اسلامی معاشرہ جبراً اور مجبوراً ایسی حکومتوں اور حکمرانوں کو قبول کرتا ہے اور اپنی جان و مال کے خوف سے وقتی طور پر خاموش ہو جاتا ہے۔

اس مفہوم کی وضاحت کے لئے مثال عرض ہے: ایک فرد کے ایک جگہ سے دوسرے مقام کی جانب منتقل ہونے کو دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ فلاں شخص یہاں سے وہاں چلا گیا اور کبھی کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو یہاں سے وہاں لے جایا گیا۔ یہاں دو فعل کا استعمال؛ ایک بصورتِ معلوم (چلا گیا) اور دوسرا بصورتِ مجہول (لے جایا گیا) درحقیقت اس بات کو واضح کرتا ہے کہ پہلی منتقلی ایک انسان کا خود آزادانہ اور اپنے اختیار سے چلا جانا ہے جبکہ دوسری منتقلی اس انسان کی خود اپنی خواہش اور پسند سے نہیں بلکہ کسی دوسرے کے جبر اور اس کی خواہش کی بنا پر ہے۔

امامؑ نے بھی فعلِ مجہول (بُلِیَتْ) استعمال کر کے حکومت یزید کے غیر قانونی اور جبری ہونے کا اعلان فرمایا ہے اور اس حکومت میں لوگوں کے حقوق، خواہشات اور آزادی کے پامال ہونے کا ذکر کیا ہے۔

☆ ہم جانتے ہیں کہ حق کا صرف ایک ہی چہرہ ہوتا ہے لیکن باطل ایک سے زیادہ چہرے اور رنگ بدل سکتا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں باطل حکومتیں مختلف انداز اور شکلوں میں ظاہر ہوئی ہیں؛ لیکن اسکے باوجود کچھ خاص قسم کے طریقوں اور کاموں کو ان کی عمومی خصوصیات کہا جا سکتا ہے۔ عہدے اور مقام و منصب سے لگاؤ، استکبار اور خود کو بڑا سمجھنا، مال و دولت کا لالچ، عیش و عشرت کی لت، تجمل پرستی، خوش گزرانی قسم کی دوسری صفات تاریخ بشریت کی تمام عوام دشمن حکومتوں میں مشترک نظر آتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی ایک حکومت کے منحوس اثرات اور خرابیوں کو اس طرح کی دوسری حکومتوں کے لئے بھی تصور کیا جا سکتا ہے۔

امام حسینؑ نے بھی ان برے اثرات اور خرابیوں کو تمام حکومتوں کے لئے عمومیت دے کر پوری تاریخ کے لئے ایک معیار اور پیمانہ پیش کر دیا ہے۔ آپؑ نے اپنی گفتگو میں "مثل" کا لفظ استعمال کر کے اس نکتے کی جانب اشارہ فرمایا ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ یزید ابن معاویہ کی حکومت سے مخصوص نہیں ہے' بلکہ اس قسم کے ہر دوسرے حاکم اور ظالم کا شیوہ بھی اسکے سوا کچھ اور نہیں ہوگا' اور ایسی حکومتوں کے ہوتے ہوئے اسلام اور آسمانی احکام ہر وقت خطرے میں رہیں گے۔

وعلی الاسلام السلام اذقد بلیت الامة براعٍ مثل یزید

۶

سعادت وشقاوت

«۔۔۔ اَلا تَرَوْنَ اِلَى الحَقِّ لا يُعملُ بِه وَاِلى الباطِلِ لا يُتَناهىٰ عَنه لِيَرغَبَ المُؤمِنُ في لِقاءِ اللّٰهِ فاِنّي لا أرىٰ المَوتَ اِلّا سَعادَةً وَالحَياةَ مَعَ الظّالِمينَ اِلّا بَرَماً۔»

«کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ حق پر عمل نہیں ہورہا اور باطل سے بچنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ایسے حالات میں مومن کو خدا سے ملاقات کی آرزو کرنی چاہئے' میں تو ان حالات میں موت کو سعادت سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندہ رہنے کو عذاب جان خیال کرتا ہوں۔»(۱)

تشریح و تفسیر

۱۔حق وباطل دو ایسے امر ہیں جن سے انسانی فطرت آشنا ہے۔یعنی بہت سے مواقع پر انسان خود بخود اور بغیر کسی تعلیم کے حق اور باطل کے درمیان تمیز کی صلاحیت رکھتا ہے۔

۱۔لہوف۔ص۳۴

حق کا پسندیدہ ہونا اور باطل کا منفور اور قابلِ نفرت ہونا بھی ان امور میں سے ہے جو ہر انسان کی سرشت میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ تمام انسان حق اور باطل کو پہچاننے کے بعد بے غرضی اور اخلاص کے ساتھ حق کی جانب جھکاؤ محسوس کرتے ہیں، ہر چند کھلم کھلا اس کا اظہار نہ کریں۔ اسی وجہ سے یہ سوال بے جا اور نامعقول نظر آتا ہے کہ آیا حق اچھا اور پسندیدہ ہے یا باطل؟

کسی معاملے میں حق اور باطل کو پہچان لینے کے بعد انسان کا ضمیر اور وجدان بغیر کسی شک اور تردد کے حق کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔

امام حسینؑ کے کلام کا بغور جائزہ لینے پر ہم دیکھتے ہیں کہ آپؑ اپنے اس استفہامی بیان کے ذریعے اسی لطیف نکتے کی جانب اشارہ فرما رہے ہیں۔ گویا اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ تم تمام انسان جانتے ہو کہ حق اور حقیقت ذاتاً پسندیدہ اور مطلوب ہے اور اس پر عمل ہونا چاہئے اور باطل سب کے لئے ذاتاً نفرت انگیز ہے اور اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ یہ کلام انسان کی اسی حق جو اور حق طلب فطرت کی جانب اشارہ ہے جسے کبھی کبھی "وجدان" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

۲۔ استفہام اور سوال مختلف معنوں کے حامل ہو سکتے ہیں۔ کبھی سوال سے مراد استفہامِ حقیقی ہے یعنی ایک مسئلے کا فہم و ادراک چاہنا ہے۔ ہماری روزمرہ گفتگوؤں اور بات چیت میں کئے جانے والے اکثر سوالات شاید اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے سوالات کے ذریعے درحقیقت ہم اپنی جہالت دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مجہول کو معلوم بنانا چاہتے ہیں۔ مثلاً ہم سوال کرتے ہیں: کیا وقت ہوا ہے؟ کیا آپ کبھی مشہد گئے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی استفہام اور سوال کا مقصد درحقیقت کسی چیز کو جاننا اور سمجھنا نہیں ہوتا، بلکہ مقصد مخاطب کو سرزنش اور توبیخ کر کے اسے کسی کام پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔

مثلاً ایک ایسا شخص جو کسی نابینا راہ گیر کو پر ہجوم ٹریفک میں پھنسا دیکھنے کے باوجود اسکی مدد کرنے کی بجائے اپنی جگہ کھڑا رہے، تو خاص لہجے میں ہم اس سے کہتے ہیں کہ کیا تمہیں نظر نہیں آرہا کہ یہ بوڑھا شخص نابینا ہے؟

اس قسم کا سوال در حقیقت اس لئے نہیں ہے کہ ہم مخاطب سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تمہیں معلوم نہیں ہے' تم نہیں جانتے ہو' بلکہ اسے سرزنش کر کے اس بات کی ترغیب دینے کی غرض سے ہوتا ہے کہ اسے چاہئے کہ وہ ایسے مواقع پر نابینا شخص کا ہاتھ پکڑ کر سڑک عبور کرنے میں اسکی مدد کرے۔

اس نکتے کو سامنے رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ کا استفہامی بیان دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے' یعنی حضرتؑ سوالیہ انداز میں یہ فرماتے ہوئے کہ: کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا۔۔۔۔۔ یہ بیان کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں کہ تم کیوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھے ہو؟ کیوں تم باطل کے سامنے مہر بر لب ہو؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اس صورتحال کے خلاف حرکت' جوش اور ولولے کا اظہار نہیں کر رہے؟

یہ خود اس بات کا عکاس ہے کہ ایسی امت اور معاشرہ جس نے باطل کے سامنے سکوت اور خاموشی اختیار کی ہوئی ہو اور اپنے لبوں پر خاموشی کی مہر لگائے بیٹھا ہو' امام حسینؑ کی نظر میں سرزنش اور توبیخ کا مستحق ہے۔ اور وہ لوگ جو اپنی آنکھوں سے حق و حقیقت کی پامالی کا نظارہ کریں اور اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کریں' واقعی سرزنش اور توبیخ کے حقدار ہیں۔

۳۔ خدا پر ایمان اور اعتقاد لازماً عملی آثار و نتائج رکھتا ہے اور انسان کو جد و جہد اور کوشش پر ابھارتا ہے۔ جہاں حرکت اور جد و جہد نہ ہو وہاں در حقیقت سچا ایمان نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسلام کی نگاہ میں ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں اور یہ کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ ایمان اور اعتقاد اگرچہ قلبی امور میں سے ہیں' لیکن زبان سے اقرار اور اعضا و جوارح سے عمل بھی ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

امام حسینؑ اپنے اس کلام میں فرماتے ہیں کہ: (ظلم و ستم کے دور میں) مومن کو خدا سے ملاقات کی آرزو کرنی چاہئے۔ یہاں ''مومن'' کی صفت کا استعمال' اس نکتے کا اعلان ہے کہ حقیقی ایمان جہاد اور عملی کوششوں کا تقاضا کرتا ہے اور دونوں کسی صورت ایک دوسرے سے جدا اور علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں۔

اس مقام پر امام حسینؑ درحقیقت اس نکتے کا اعلان فرما رہے ہیں کہ ایمان کا لازمی تقاضا جہاد' شہادت اور فداکاری ہے۔ اس موقع پر ایک اور نتیجہ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہمیں اپنے ایمان اور اعتقاد میں اس قسم کے آثار و نتائج نظر نہیں آئیں' تو ہمیں اپنے ایمان اور اس کی بنیاد کی اصلیت کے بارے میں شک اور شبہ کرتے ہوئے اس کی مضبوطی کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔

۳۔ "موت و حیات" دو باہم متصادم اصطلاحیں اور مفاہیم ہیں' جو مختلف مواقع اور معاملات میں استعمال ہوتے ہیں اور ہر ایک میں مخصوص معنی کا اظہار کرتے ہیں۔

جب ہم بائیلوجی اور فزیالوجی کے موضوع کے تحت موت و حیات کی بات کرتے ہیں' تو ہمیں ہماری مراد اقدار' اخلاق اور معنویات کی موت و حیات نہیں ہوتی۔ یعنی اس موقع پر ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ایسا موجود ذی حیات ہے جو رشد و نمو اور حرکت کا حامل ہو اور جس موجود میں یہ آثار نظر نہیں آئیں وہ مردہ موجود ہے۔ یہاں جسمانی اور فزیکل موت و حیات کی بات ہے۔

مادی' تعلیمات و نظریات میں بھی موت و حیات کی اس کے علاوہ کوئی اور تفسیر نہیں لیکن الٰہی تصورِ کائنات اور اسلامی تعلیمات میں موت و حیات کی اصطلاحات دوسرے معنوں کے لئے بھی استعمال ہوتی ہیں۔ کیونکہ انسان ایک ایسا موجود ہے جس کے دو پہلو ہیں اور وہ جسم و بدن کے علاوہ ایک اور عنصر کا بھی مالک ہے جسے روح کہتے ہیں۔ لہٰذا موت و حیات جسمانی پہلو کے علاوہ انسان کے معنوی اور روحانی پہلو میں بھی مدنظر ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے نکتۂ نظر سے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک انسان زندہ اور جسمانی طور پر مکمل سلامت اور صحت مند ہونے کے باوجود مردہ ہو۔ کیونکہ ایسے انسان کی بشری روح اور انسانی نفس کی موت واقع ہو چکی ہے اور اس میں معنویت اور انسانیت کا کوئی نام و نشان نہیں رہا ہے۔

سعادت اور شقاوت کے الفاظ بھی کبھی روح کے بارے میں کہے جاتے ہیں اور کبھی لذتوں یا جسمانی تکلیفوں کے بارے میں استعمال ہوتے ہیں۔ ایسا انسان جس کی

ضروریات خوراک اور پوشاک وغیرہ کے لحاظ سے پوری ہوتی ہوں' جو ناز و نعم کے ساتھ دن گزار رہا ہو وہ جسمانی سعادت کا حامل ہے لیکن ممکن ہے روحانی اور معنوی اعتبار سے انتہائی شقاوت اور بدبختی کی حالت میں ہو۔ اسکے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ ایک انسان جو مادّی اور ظاہری اعتبار سے فقر و تنگدستی کا شکار ہو وہ روحانی اور معنوی کمالات کے لحاظ سے کمال و سعادت کی بلندیوں پر فائز ہو۔

ایک ایسا معاشرہ جسے فساد اور تباہی نے پوری طرح گھیر رکھا ہو اور یزید جیسے حاکم اس پر مسلط ہوں' اس میں درحقیقت انسانیت' شرافت اور معنویت مٹ جائیں گی۔ اس موقع پر روحانی اور معنوی حیات کا ذکر بے معنی ہوگا اور انسانی سعادت اور کمال جیسے مفاہیم اور اصطلاحات کھوکھلے اور پوچ ہو جائیں گے۔

اگرچہ ممکن ہے ایسے معاشرے میں مادّی رفاہ و آسائش کے امکانات ہر لحاظ سے موجود ہوں لیکن حقیقی سعادت اور واقعی انسانی کمال ہرگز حاصل نہ ہو سکے گا۔

مذکورہ وضاحتوں کے ذریعے' امام حسینؑ کے زیر بحث کلام کا مفہوم بخوبی روشن ہو جاتا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ یزیدی حکمرانوں کے دور اقتدار میں موت اور شہادت کیوں سعادت اور خوش بختی ہے اور ایسے حالات میں زندہ رہنا کیوں ذلت و عار قرار دیا گیا ہے۔

امامؑ کے اس کلام میں اہم اور بنیادی ترین نکتہ حیات و سعادت یا موت اور شقاوت کا روحانی اور معنوی پہلو ہے جسمانی اور مادّی پہلو نہیں۔

۷

جوانمردی اور آزادی

«إن لَمْ يَكُنْ لَكُمْ دينٌ وَكُنتُمْ لا تخافُونَ المَعادَ فَكُونوا أحراراً في دُنياكُم»

«اگر کسی دین و آئین پر عقیدہ نہیں رکھتے، اور روزِ قیامت کا بھی تمہیں کوئی خوف نہیں، تو کم از کم آزاد مردوں کی سی زندگی تو جیو۔» (۱)

تشریح و تفسیر

۱۔ اگرچہ امام حسینؑ نے عاشورا ۶۱ھ کے روز یہ کلام ارشاد فرمایا، اور اس میں آپ کا مخاطب ایک خاص گروہ تھا، جو آپؑ سے جنگ پر آمادہ تھا، لیکن کیونکہ یہ ارشاد ایک آفاقی اصول بیان کر رہا ہے اس لئے اسے کسی بھی صورت میں کسی خاص زمان یا مکان تک محدود نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ عمومی اور ہر دور کے لئے ہے۔

۱۔ مقتل خوارزمی۔ ج ۲۔ ص ۳۲

اصولاً حق کی ایک خصوصیت اور خاصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ‹‹حق›› ہوتا ہے۔ حقیقت کبھی بھی کسی خاص زمان ومکان تک محدود نہیں ہوتی' کیونکہ یہ ریاضی کے قواعد مثلاً ۲x۲=۴ کی مانند ہر زمان اور تمام مکانوں میں یکساں رہتی ہے۔

ایسی گفتگو اور الفاظ جو حق پر مبنی ہوں' وہ زمان ومکان کی قید اور محدودیت قبول نہیں کرتے۔ اور شاید کلام الٰہی اور انبیا اور ائمہ کے کلمات وفرامین کی جاویدانگی اور دوام کا بنیادی راز یہی ہو۔ امام حسینؑ کا فرمان بھی اس خصوصیت میں شامل ہے اور کیونکہ آپ کا کلام بجا اور حق وحقیقت پر مبنی ہے لہٰذا اسے ہرگز کسی خاص دور اور خاص نسل سے متعلق قرار نہیں دیا جاسکتا' جب تک لیل ونہار کی گردش جاری ہے اور روئے زمین پر انسانی حیات موجود ہے' اُس وقت تک اس کلام کے مصادیق پائے جاتے رہیں گے۔

۲۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ تمام آسمانی ادیان کے رہنما اصول اور اساسی قواعد انسانی عقل ووجدان کے مطابق اور اصطلاحاً انسانی فطرت سے سازگار ہوتے ہیں۔

بالفاظ دیگر انبیائے الٰہی اور رہنمایانِ دین کی اکثر ہدایات وتعلیمات جیسے' والدین کا احترام' کمزوروں اور لاچاروں کی مدد' ظلم وزیادتی سے پرہیز' علم ودانش کا حصول وغیرہ وغیرہ۔۔ ایسی اقدار ہیں کہ اگر بالفرض انہیں دینی اور مذہبی تعلیمات کے حوالے سے نہ بھی دیکھیں تب بھی انسان انہیں اچھا اور پسندیدہ سمجھتا ہے اور ان کی پیروی کرتا ہے۔

اپنے وسیع معنی میں ‹‹حریت اور آزادگی›› بھی انہی امور میں سے ایک ہے۔ جوانمردی اور مروت ایک ایسی چیز ہے جسے انسانی فطرت ووجدان بذاتہ پسند کرتے ہیں۔ اور ان چیزوں کی یہ پسندیدگی اور محبوبیت صرف آسمانی ادیان کے پیروکاروں اور کتبِ الٰہی پر عقیدہ رکھنے والوں ہی تک محدود نہیں بلکہ تمام افرادِ بشر ‹‹حریت›› یعنی آزادگی' جوانمردی اور مروت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسکی قدر وقیمت کے قائل ہیں۔

امام حسینؑ کا مذکورہ بالا کلام کربلا کے مقتل سے تمام انسانوں کو خطاب کرکے درحقیقت

ایک عمومی پیغام اور ایک عالمی منشور ہے، جس میں آپؑ نے فرمایا ہے کہ:

"اگر تمہارا کوئی دین و ایمان نہیں اور تمہیں قیامت اور خدا کے سامنے حاضری کا خوف نہیں تو کم از کم دنیا میں آزاد مردوں ہی کی طرح رہو۔"

❁❁❁

۸

بندگی کی اقسام

«إنَّ قوماً عَبَدوا اللّٰہَ رَغبَۃً فَتِلکَ عِبادَۃُ التُّجّارِ وَإنَّ قوماً عَبدوا اللّٰہَ رَھبَۃً فَتِلکَ عِبادَۃُ العَبیدِ وَإنَّ قوماً عَبَدوا اللّٰہ شُکراً فَتِلکَ عِبادَۃُ الاَحرارِ وَھِیَ اَفضَلُ العِبادَۃِ»

««بے شک ایک گروہ بہشت اور آخرت کی ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کی امید میں خدا کی عبادت کرتا ہے' ایسی عبادت تاجروں کی سی عبادت ہے۔ ایک دوسرا گروہ عذاب اور دوزخ کے خوف سے خدا کی عبادت میں مشغول ہے' یہ غلاموں کی سی عبادت ہے۔ جبکہ ایک اور گروہ ہے جو خدا کو شکر و سپاس کے لائق اور اس کا حقدار سمجھ کر اسکی عبادت کرتا ہے' ایسی عبادت احرار اور آزادوں کی عبادت ہے' اور یہی سب سے بہتر عبادت ہے۔»» (۱)

۱۔ تحف العقول۔ ص ۱۷۵

تشریح و تفسیر

۱۔ عربی زبان میں «عَبَدَ» کے معنی ہیں صاف کرنا اور ہموار بنانا۔ لہٰذا جب «عبد الطریق» کہا جاتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں راستے کو صاف اور ہموار کرنا۔ لفظ عبادت بھی جو خدا کی پرستش کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے در حقیقت ایک طرح سے دل کو گندگی سے پاک و صاف کرنے اور روح کو صرف اور صرف خالقِ کائنات کی بندگی کے لئے خالص کر دینے کی جانب اشارہ ہے۔

خدا کے مخلص بندوں کے دل آئینے کی مانند شفاف اور روشن ہوتے ہیں اور ان سے صرف نورِ الٰہی منعکس ہوتا ہے، کسی بھی صورت میں اس پر گناہوں کا زنگ اور نافرمانیوں کی گرد یا تو بیٹھی ہی نہیں یا حقیقی توبہ کے ذریعے صاف ہو چکی ہے۔

۲۔ «رغبت» کے معنی کسی چیز کی جانب میل یا اسکی جانب جھکاؤ ہے۔ اگرچہ امام حسینؑ کے اس کلام میں اس بات کا ذکر نہیں ہوا ہے کہ یہ میل و رغبت کس جانب ہے لیکن قرآنی آیات اور دوسری روایات پیشِ نظر ہوں تو واضح ہے کہ اس سے مراد نعمات اور بہشت میں خداوندِ عالم کی طرف سے ملنے والی جزا کی جانب میل و رغبت ہے۔

تاجر پیشہ انسان اپنے تجارتی سودوں میں جب کسی کو کوئی مال دیتا ہے تو اس کے عوض کوئی چیز وصول کرتا ہے۔ یہاں کسی کو کچھ دینا اس سے کچھ لینے کے لئے ہوتا ہے۔ یعنی اگر فریقِ مقابل مال کے بدلے میں اسے پیسے یا کوئی جنس ادا نہ کرے تو تاجر یا ہرگز اسے کچھ حوالے نہیں کرے گا۔

لوگوں کا ایک گروہ بھی عباداتِ الٰہی جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ میں یہی نکتہ نظر رکھتا ہے۔ یعنی ان امور کی انجام دہی کو درحقیقت خدا سے تجارت اور ایک سودا سمجھتا ہے۔ اور خود کو خدا کے سامنے طلبگار اور حقدار شمار کرتا ہے، اور ہر عبادت کو کسی لذت اور نعمت کے حصول کے لئے انجام دیتا ہے۔ یہاں تک کہ بالفرض اگر خداوندِ عالم ان نعمات اور لذتوں کا وعدہ نہ کرتا، تو یہ لوگ بھی کبھی خدا کے سامنے سجدہ ریز نہ ہوتے اور اسکی عبادت نہ کرتے۔ شاید یہ کہنا درست ہو کہ اکثر افراد کی

عبادات صرف اُخروی جزا اور نعمتوں کے لئے ہوتی ہیں۔

۳۔ انسان اپنے مزاجوں اور ذہنوں میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہوتے ہیں۔ ایک گروہ لذتوں اور خوشیوں کا اس قدر شوقین ہوتا ہے کہ ان کے حصول کے لئے ہر قسم کے خطرات قبول کرنے پر تیار ہو جاتا ہے' تاکہ مثلاً بہترین خوراک اور پوشاک حاصل کرلے۔ ایسے لوگ کبھی کبھی معمولی معمولی چیزوں کے لالچ میں بھی صعوبتیں' مشقتیں اور مشکلات جھیلتے ہیں۔

ان لوگوں کے برعکس ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جنہیں لذتوں سے کچھ خاص لگاؤ اور رغبت نہیں ہوتی' لیکن صعوبتوں اور سختیوں سے شدید خوفزدہ رہتے ہیں اور معمولی تکلیف اور دباؤ برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتے۔ ممکن ہے ایسے لوگ بھی معمولی عذاب اور سختی کے خدشے کی بنا پر بہترین لذتوں اور خوشیوں کو چھوڑ دیں' تاکہ اس طرح اپنے آپ کو سختیوں اور صعوبتوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ بالفاظ دیگر ان لوگوں کے لئے اہم چیز مشکل اور زحمت سے محفوظ رہنا ہے' خواہ کوئی لذت ملے یا نہ ملے۔

پہلا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو عباداتِ الٰہی کے مسئلے میں تاجروں کا سا رویہ رکھتے ہیں۔ (ایسے ہی لوگوں کی جانب ہم دوسرے نمبر کے ضمن میں اشارہ کرچکے ہیں) جبکہ اس پہلے گروہ کے برخلاف' دوسرا گروہ عبادات اور خدا کی طرف سے عائد کردہ فرائض کو حصولِ لذت کے لئے انجام نہیں دیتا' بلکہ مشکلات سے محفوظ رہنے اور خدا کے عذاب اور سختیوں سے نجات کی خاطر بجالاتا ہے۔ شاید اگر صرف اور صرف اجر وثواب کا مسئلہ درپیش ہوتا' عذاب اور سزائیں نہ ہوتیں' تو یہ گروہ کبھی خدا کی عبادت اور اسکے احکام کی بجا آوری پر تیار نہ ہوتا' لیکن کیونکہ الٰہی احکام انجام نہ دینے کی صورت میں عذاب اور دوزخ کا خطرہ درپیش ہے' لہٰذا یہ خدا کی عبادت بجالاتے ہیں۔

۴۔ لوگ خداوند عالم کی شناخت و معرفت کے حوالے سے بھی مختلف درجات و مراتب رکھتے ہیں۔ اس معرفت کی انتہا وہ معرفت ہے جو اولیائے خدا اور انبیائے الٰہی ذاتِ پروردگار کے بارے میں رکھتے ہیں۔ ہمارے عصر کے عظیم فقیہ' عارف اور بلند پایہ فلسفی' جمہوری اسلامی ایران کے بانی'

حضرت امام خمینیؒ کے بقول یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے سامنے اپنی کسی حیثیت کے قائل نہیں ہوتے اور کائنات میں جو کچھ بھی ظاہر و پنہاں ہے اسے اس (ذات باری) کے جلوؤں میں سے ایک جلوہ اور اس کی ہستی کے مظاہر میں سے ایک مظہر سمجھتے ہیں۔

ان لوگوں نے خدا کو عبادت و پرستش کا مستحق سمجھ کر جان و دل سے اسکی عبودیت اور بندگی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا ہے اور ہر حال میں اسکے فرمان کے سامنے تسلیم ہیں۔ نعمتوں کی امید یا عذاب اور سختیوں کے خوف سے نہیں بلکہ صرف اس لئے اپنے خالق کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں کیونکہ اسے عبادت و پرستش کے لائق سمجھتے ہیں۔

یہ لوگ درحقیقت نہ ہی تو آخرت کی نعمتوں اور خوشیوں کی چاہت کے اسیر ہیں اور نہ دوزخ کے خوف سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اپنے معبود کے جلال و جمال میں محو ہیں اور صرف وہی ان کی نظروں کا محور ہے' کسی اور طرف ان کی نگاہ جاتی ہی نہیں۔

۵۔ تاجر' غلام اور آزاد کی ان تین صفات کا موازنہ کر کے شاید یہ کہا جا سکے کہ پہلے دو گروہوں پر تیسرے گروہ کو یہ فوقیت اور امتیاز حاصل ہے کہ: پہلے دو گروہ (تاجر اور غلام) ایک طرح کی اسیری میں مبتلا ہیں۔ ایک گروہ نعمتوں اور لذتوں کا اسیر ہے' تو دوسرا مشکلات اور صعوبتوں کے خوف کا اسیر۔ وہ واحد گروہ جسے ان امور میں سے کسی کی فکر نہیں اور جو خدا کی عبادت صرف اور صرف اسے عبادت کا مستحق سمجھ کر کرتا ہے' وہ تیسرا گروہ ہے' جو واقعاً آزاد کی صفت کا حقدار ہے۔

۶۔ ہماری اس گفتگو سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ تیسرے گروہ (آزاد) کی عبادت کیوں سب سے بہتر عبادت اور پرستش کی بہترین قسم شمار کی گئی ہے۔

آخری جملے میں "افضل" کی صفت کا استعمال' ایک اور ظریف نکتے کی جانب اشارہ کرتا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ہر چند تیسرے گروہ کی عبادت برترین اور افضل ترین عبادت ہے لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ پہلے دو گروہوں کے اعمال یکسر عبادت ہی شمار نہیں کیے جائیں گے۔ نہیں' ایسا نہیں ہے' اس موازنے میں تینوں گروہوں کے عمل کی وجہ اشتراک خدا کی عبادت اور پرستش ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا' خدا کے بارے میں انسانوں کی شناخت و معرفت کے مختلف مراتب و درجات کی بنیاد پر ان کی عبادتوں کی کیفیت اور قدر و قیمت بھی مختلف ہوتی ہے' اور اسکی وجہ سے بعض کو بعض پر امتیاز حاصل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی عبادات اور دینی فرائض کی انجامدہی کے دوران ہرگز پژمردگی اور ناامیدی کا شکار نہیں ہونا چاہیے' کیونکہ ممکن ہے ہم انہی صوری اور ظاہری اعمال کی تکرار اور مسلسل انجامدہی کے اثر سے خدا کی معرفت کے بلند درجات و مراتب تک پہنچ کر اپنی عبادات کی کیفیت اور قدر و قیمت میں اضافہ کر لیں۔

۹

ہدایت اور گمراہی

«اِمامٌ دَعا اِلیٰ ھُدیً فَاَجابُوا اِلَیہِ وَاِمامٌ دَعا اِلیٰ ضَلالَۃٍ فَاَجابوا اِلَیھا، ھٰؤُلاءِ فی الجَنَّۃِ وَھٰؤُلاءِ فی النّارِ وَھُوَ قَولُہ تَعالیٰ فَرِیقٌ فی الجَنَّۃِ وَفَرِیقٌ فی السَّعِیرِ»

«ایک امام و پیشوا ایسا ہے جو لوگوں کو سعادت اور ہدایت کی طرف دعوت دیتا ہے، اور ایک گروہ اس کی دعوت کو قبول کر کے اس کی پیروی کرتا ہے۔ اسکے بالمقابل ایک ایسا بھی امام اور پیشوا ہے، جو لوگوں کو ضلالت اور گمراہی کی طرف بلاتا ہے، ایسے رہنما کے پیروکار بھی ہوتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں سے پہلا گروہ اہلِ جنت کا گروہ ہے، جبکہ دوسرا گروہ جہنم میں جائے گا۔ اور یہ کلامِ الٰہی اسی بارے میں ہے کہ: ایک گروہ جنتی اور ایک گروہ جہنمی۔»

تشریح و تفسیر

ا۔ انسان کے اندر ہمیشہ دو باہم مخالف پہلو کشمکش اور ایک دوسرے کے ساتھ حالتِ جنگ میں

رہتے ہیں۔ عقل اور نفس دونوں میں سے ہر ایک انسان کو ایک خاص سمت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر الٰہی اور آسمانی پہلو انسان کو معنویات' کمالات اور اعلیٰ وارجمند اقدار کی جانب کھینچتا ہے۔ اسکے مقابل حیوانی اور دنیوی پہلو اسے زیادہ سے زیادہ حیوانی شہوتوں اور نفسانی خواہشات کے حصول میں مشغول رکھ کر بلندی اور کمال کے حصول سے باز رکھتا ہے۔

۲۔ دورانِ عمل انسان ان دونوں (انسانی اور حیوانی پہلوؤں) میں سے جس پہلو کی جانب جھکاؤ ظاہر کرتا ہے' اسی کے کیمپ میں اسکا شمار ہونے لگتا ہے۔ یعنی وہ یا تو انسانی صف میں ہوتا ہے' یا حیوانی صف میں۔

وہ لوگ جو عقل کی آواز پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے نفس کو عقل کے تسلط اور اسکے کنٹرول میں لے آتے ہیں' وہ ایک گروہ میں قرار پاتے ہیں' اور وہ لوگ جو نفسانی خواہشات اور شہوتوں کے اسیر ہو جاتے ہیں' وہ ایک دوسرا گروہ تشکیل دیتے ہیں۔

یہیں پر تاریخِ بشریت بھی دو کناروں میں تقسیم ہو جاتی ہے' دو صفوں میں بٹ جاتی ہے' ایک گروہ حق کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے اور دوسرا گروہ باطل کی صف میں۔ اس موقع پر ہدایت اور گمراہی کے ان دونوں گروہوں کے درمیان جنگ و رزم آرائی قدرتی اور ناقابلِ اجتناب ہے۔ کیونکہ حق و باطل' نور و ظلمت اور ہدایت و ضلالت کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف جنگ و ستیز کی حالت میں رہتے ہیں۔

۳۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں حق کی صفوں اور باطل کے گروہ میں ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں اور پیدا ہوتے ہیں جو دوسروں سے آگے بڑھ کر اپنے اپنے گروہ کی قیادت ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اور اپنے اپنے گروہ کی امامت و پیشوائی کے منصب پر فائز ہو جاتے ہیں۔ ایسا شخص جو حق کے گروہ کا امام ہو وہ "امام الهدیة" کہلاتا ہے' اور اسکے مدِمقابل کو "امام الضلالة" کہتے ہیں' ایک "نور" کی طرف دعوت دیتا ہے اور دوسرا "نار" کی طرف بلاتا ہے۔ هٰؤلاء فی الجنّة وهٰؤلاء فی النّار۔

تاریخ بشریت اس حقیقت کی گواہ ہے کہ انبیائے الٰہی اور آسمانی رہنماؤں کے بالمقابل ہمیشہ طاغوتوں نے صف بندی کی ہے اور اِن لوگوں نے ہدایت کی طرف انبیا کی دعوت کے برخلاف انسانوں کو گمراہی کے راستے کی جانب دھکیلا ہے۔

امام حسینؑ نے اپنے اس کلام میں' انسانی تاریخ میں موجود اس گروہ بندی اور ان دونوں مراکز کی امامت و پیشوائی کی جانب اشارہ کر کے' آیہ قرآن کو سند قرار دیتے ہوئے (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۷۱) ان دونوں کے انجام کو بیان فرمایا ہے:

فَرِیقٌ فِی الجَنَّۃِ وَ فَرِیقٌ فِی السَّعِیرِ۔

۱۰

خدا پر بھروسہ

«اَللّٰھُمَّ اَنْتَ ثِقَتِي فِي كُلِّ كَرْبٍ وَرَجائِي فِي كُلِّ شِدَّةٍ وَاَنْتَ لِي فِي كُلِّ اَمْرٍ نَزَلَ بِي ثِقَةٌ كَمْ مِنْ هَمٍّ يَضْعُفُ فِيهِ الْفُؤَادُ وَتَقِلُّ فِيهِ الْحِيلَةُ وَيَخْذُلُ فِيهِ الصَّدِيقُ وَيَشْمَتُ فِيهِ الْعَدُوُّ اَنْزَلْتُهُ بِكَ وَشَكَوْتُهُ اِلَيْكَ رَغْبَةً مِنِّي اِلَيْكَ عَمَّنْ سِوَاكَ فَكَشَفْتَهُ وَفَرَّجْتَهُ فَاَنْتَ وَلِيُّ كُلِّ نِعْمَةٍ وَمُنْتَهٰى كُلِّ رَغْبَةٍ»

«پالنے والے! تو ہی ہر رنج و غم میں میرا بھروسہ ہے' ہر سختی میں تو ہی میری امیدوں کا مرکز ہے' جب بھی مجھ پر کوئی مصیبت پڑی' تو تو ہی میرا آسرا اور اس مصیبت سے چھٹکارے کا ساماں ہے۔ نہ جانے کتنے مصائب و آلام تھے جن میں دل کمزور پڑا' چارہ جوئی کی راہ مسدود ہوئی' دوستوں نے ساتھ چھوڑ دیا' دشمنوں نے خوشیاں منائیں۔ میں نے ان مصائب و آلام میں گھبر کر تیری طرف رجوع کیا' اپنا غم تجھ ہی سے بیان کیا' تیرے ماسوا سے بے نیاز ہو کر تجھ ہی سے آرزومند ہوا

اور تو نے وہ مصائب و آلام دور کر دیئے ان کے گھیرے سے مجھے باہر نکال دیا۔ تو ہی ہر نعمت کا مالک اور تمام نیکیوں والا اور قبلۂ حاجات ہے۔»

تشریح و تفسیر

۱۔ سچوں کی صداقت اور دوستوں کی دوستی کو عام حالات میں نہیں پرکھا جا سکتا۔ ناگوار حالات اور مشکل اور سخت ایام میں سچے دوستوں اور جھوٹے دوست نماؤں اور منافقوں کو پہچانا جا سکتا ہے۔

وہ لوگ جو صرف جاہ و مقام' مال و دولت' خوشیوں اور لذتوں کی امید میں انسان کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں اور اس سے دوستی اور برادری کا رشتہ جوڑتے ہیں' وہ درحقیقت دھوکے باز دوست اور مکار و عیار افراد ہوتے ہیں۔

امامؑ اپنے اس کلام میں اس نکتے کی جانب بھی اشارہ فرماتے ہیں کہ انسان کے حقیقی دوست خوشیوں اور آسودگی کے دنوں میں نہیں بلکہ ناگوار حوادث اور مصیبتوں کے پیش آنے پر پہچانے جاتے ہیں۔

۲۔ اہلِ معرفت صرف خدا کی ذات کو قدرت و طاقت کا منبع و مبدا سمجھتے ہیں' دوسری تمام توانائیوں اور طاقتوں کو اسی سے وابستہ اور اسی کی عطا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ خدا کے سوا تمام کو معلول اور اسی سے عین الربط قرار دیتے ہیں اور اسکے لامحدود وجود اور اسکی بے پایاں قدرت کی ایک شعاع شمار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلاؤں اور سختیوں کے موقع پر بھی ہرگز محدود مادّی قوتوں پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کرتے اور اپنا دستِ نیاز صرف اسی بے نیاز «خدا» کے سامنے دراز کرتے ہیں۔

امام حسینؑ اپنی اس مناجات میں عشقِ الٰہی سے سرشار دل کے ساتھ اپنے معبود سے محوِ کلام ہیں اور اپنے ایک ایک لفظ کے ذریعے خدا کی ذات پر اپنے ایمان' اعتماد اور توکل کا درس دے رہے ہیں۔

آپؑ کا پیغام یہ ہے کہ تمام ظاہری قدرتوں اور طاقتوں کے اوپر آخرکار کامیابیوں اور

ناکامیوں کا تعین کرنے والی ذات ، ذاتِ کردگار ہے، انسان کو چاہیے کہ صرف اسی سے دل لگائے اور صرف اسی سے امید رکھے۔

ومن اللہ التوفیق و علیہ التکلان۔

ہماری مطبوعات

ہمارے ائمہؑ اور سیاسی جدوجہد	آیت اللہ سید علی خامنہ ای
دنیائے جوان	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
فکرونظر	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
امام حسینؑ نے کیوں قیام فرمایا؟	علامہ ابراہیم امینی، محمد باقر شریعتی سبزواری
حسین ابن علیؑ کا خطاب	محمد صادق نجمی
حسین ابن علیؑ مدینہ تا کربلا	محمد صادق نجمی
نہج البلاغہ اور حیات اجتماعی	شیخ حسن موسیٰ صفار
نوجوانوں کے لئے جاننے کی باتیں	رضا فرہادیان
ماہِ رمضان تزکیۂ نفس اور اصلاحِ کردار کا مہینہ	مجلسِ مصنفین
اسلامی تحریک قرآن وسنت کی روشنی میں	شیخ محمد حسن صلاح الدین
فقہ زندگی	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
عبادت ونماز	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
توبہ کیا ہے کیسے قبول ہوتی ہے	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
بہترین عشق	جواد محدثی
عباد الرحمٰن کے اوصاف	محمد محمدی اشتہاردی
اسلام اور عصرِ حاضر کی ضروریات	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
جہاد	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
معنوی آزادی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ائمہ اہل بیتؑ کی فکری وسیاسی زندگی	رسول جعفریان (زیر طبع)
سیری در سیرۂ نبوی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیر طبع)
خاتمیت	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیر طبع)

دار الثقلین

